

تفسیر "سورہ البقرہ" (آیات 21 تا 25)

<?xml encoding="UTF-8">

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (21)

اے انسانو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور انہیں بھی جو تمہارے پہلے تھے عجیب نہیں کہ تم اپنے بچاؤ کا سامان کر سکو"

مخصوص طریق عبادت جیسے روزہ وغیرہ کا جہاں قرآن میں حکم دیا ہے وہاں "یا ایہا الذین آمنوا" کہہ کر پکارا ہے اس لیے کہ جنہوں نے اصل رسالت و شریعت کو تسلیم ہی نہیں ان سے جزئیات احکام اور طریق عبادت کے بتانے کا کوئی محل نہیں۔ مگر مطلق عبادت یعنی خدا کی بارگاہ میں احساس بندگی کی پیش کش کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے یہاں "یا ایہا الناس" کہہ کر مخاطب کیا جا رہا ہے اس لیے کہ خالق کی عبودیت کا جب احساس پیدا ہوگا اسی وقت تو وہ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے اور کم از کم اس پیام پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ اور اسی لیے یہ احساس عبودیت جس کی دعوت دی گئی ہے اس کا نتیجہ بتایا ہے "لعلکم تتقون" : "اتقاء" کے معانی ہیں کسی خطرہ سے بچنے کا سامان کرنا۔ چونکہ خالق کی طرف ذہن کی توجہ ہونے کے ساتھ انسان کو یہ فکر ہونی چاہیئے کہ اس کے مجھ پر کچھ حقوق ہیں اور اُن حقوق کے ادا نہ کرنے سے میں مستحق سزا ہوں گا۔ اسی سے خطرہ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اسی خطرہ سے تحفظ کے لیے اس کی طرف سے رسالت کا ادعاء رکھنے والے کی باتوں پر کان لگانے اور انکی سچائی پر غور کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے جس پر آئندہ کے تمام ذرائع نجات کا انحصار ہے۔

**

"الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ

أَذْدًا أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (22)

جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اوپر سے پانی برسایا تو اس سے پہلوں کے قبیل سے

تمہاری غذا برآمد کی۔ اب اس کے بعد جان بوجھ کر اللہ کے لیے برابر دار نہ بناؤ"

قرآن مجید میں زمین آسمان اور دیگر کائناتِ عالم جو ذکر ہے وہ اس مقصد کے لیے نہیں ہے کہ انکی حقیقتوں اور ماہیتوں کو بیان کیا جائے بلکہ ایک تو ان کے افادی پہلوؤں کو جو بنی آدم سے متعلق ہیں نمایاں کر کے اللہ کی نعمتوں کا احساس کرانا منظور ہے اور دوسرے انکی عظمت اور حیرت انگیز خلقت کی طرف توجہ دلا کر خالق کی عظمت و قدرت کی طرف توجہ دلانا مطلوب ہے۔ زمین چاہے گُروی ہو اور چاہے مسطح بہر حال جہاں تک ہمارے لیے کارآمد اور محسوس پہلو کا تعلق ہے وہ ایک بچھونے ہی کی حیثیت رکھتی ہے (2) اور

اس میں خاص توجہ دلانے والا جزء یہ ہے کہ یہ بچھونا کس نے قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اسی نے جس نے اس زمین کو خلق فرمایا۔ اسی طرح آسمان ، وہ کوئی ٹھوس جسم ہے یا سیال مادہ ہے اسے قرآن کچھ نہیں بتاتا۔ بے شک اس کی محسوس شکل جو ہر آنکھ کے سامنے ہے وہ یہی کہ وہ ہمارے سروں پر ایک چھت کی طرح بلند ہے۔ بس اسی کو سامنے رکھ کر اس کے خالق کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

اس کو سائنس اور ریاضی کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انکی حقیقتوں کو معلوم کرنے کے میدان میں فہم بشری کو تگ و دو کی پوری آزادی حاصل ہے۔ (3)

"السماء" کا لفظ جو پہلی دفعہ ہے وہ تو آسمان کے معنی میں ہے اور دوسری جگہ اس کی سمت یعنی اوپر کا رخ مقصود ہے۔ عربی میں بلندی کے رُخ کی ہر شے کو "سماء" کہتے ہیں۔ (4)

زمین اور آسمان کے تذکرہ کے بعد ان دونوں کے مابین جس نعمتِ الہی کا ظہور ہوتا ہے وہ بارانِ رحمت ہے۔ اس کا اتارنے والا بھی وہی اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کیے۔

جاہلیت والے عرب چاہے پرستش کتنے اصنام کی کرتے ہوں اور اللہ کو بالکل بھول گئے ہوں مگر تحت الشعوری طور پر یہ اُن سب کو احساس تھا کہ پیدا کرنے والا آسمان و زمین وغیرہ کا ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ خود قرآن مجید میں ہے :

"وَلئن سألْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ"

اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ نے ("لَقمان#38) دوسری جگہ ہے :

"وَلئن سألْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَالسُّمُورَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ" (العنكبوت#61)

اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور آفتاب و مابتاب کس کے قبضہ میں ہیں تو کہیں گے اللہ کے "

مگر عبادت کے محل پر وہ اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کے سامنے بھی جھکتے تھے اور اس وقت عملی طور پر یہ چیز بھول جاتے تھے کہ اصل جو ہے وہ اللہ ہے۔ یہ چیزیں کچھ بھی نہیں ہیں۔ قرآن نے اُن کے اسی تحت الشعوری احساس کو اُبھارتے ہوئے ان کو ان کے عمل کی غلطی کا احساس پیدا کر دیا ہے اور اسی لیے کہا گیا : "یہ جانتے ہوئے اب تو اللہ کے لیے ہمسر نہ تیار کرو"

غالباً دوسری قومیں جنہوں نے بے شمار دیوی دیوتا قرار دے لیے ہیں وہ بھی تحت الشعوری طبقاتِ نفس میں کسی ایک واحد ذات کو مانتی ہیں جو ان سب سے بالاتر ہے۔ اس کے بعد قرآن کی یہ آیت ان کے لیے بھی ایک لمحہ فکر پیدا کرنے کے لیے کافی ہے کہ اگر ایک ذات اس تمام کائنات کے لیے کافی ہے تو اس کے مقابل میں ان تمام دیویوں ، دیوتاؤں کے ماننے کی کیا ضرورت ہے۔

**

"وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ" (23).

اور اگر تم اس کی طرف سے جوہم نے اپنے بندہ پر اتارا شک میں مبتلا ہو تو اس قبیل کا ایک سورہ لے آؤ اور جو اللہ کو

چھوڑ کے حامی تمہارے ہیں انہیں بلا لو اگر تم سچے ہو"

پہلے جو کہا گیا تھا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ اس میں کوئی شک کرنے والا نہیں بلکہ مقصود اس سے یہ تھا کہ اس کتاب کی اولہ حقانیت ایسے نمایاں ہیں جو شک کی گنجائش نہیں رکھتے اب اگر شک ہوگا تو ان دلائل سے بے توجہی کی بنا پر یا شک کا اظہار ہوگا تو بر بنائے عناد ان دلائل سے چشم پوشی کی بنا پر۔ دونوں صورتوں میں بالمقابل اُن خصوصیات کی طرف ذہن کا متوجہ کرنا کافی ہے جس کا نتیجہ پہلی صورت میں ازالہ غفلت ہوگا اور دوسری صورت میں اتمام حجت۔

اس ذہن کے متوجہ کرنے کے لیے قرآن کریم نے یہ نفسیاتی طریقہ اختیار کیا کہ گرم سے گرم الفاظ اور تیز سے تیزتر انداز میں انہیں اس کا مثل لانے اور اس کے جواب میں دوسری کتاب تیار کرنے کی دعوت دی جائے۔ وہ غیور، باحمیت اور پرجوش عرب جو بات پر جان دینے تک کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ ان طعنوں، سرزنشوں، ان مبارز طلبیوں کو سُنکر ضرور اپنی پوری غوروفکر کی طاقتوں سے اس کا جواب تیار کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ یقینی ہے کہ وہ ناکام اور عاجز رہیں گے۔ اس عاجزی کے بعد اگر وہ بے ہوش ہیں تو ہوش میں آئیں گے اور ضرور اُن خصوصیات کی طرف متوجہ ہونگے جو اس قرآن میں مافوق البشر درجہ تک مضمحل ہیں تب انہیں ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا اور اگر وہ بر بنائے عناد انکار کرتے رہیں تب بھی کم از کم اس کے بعد انکی پیشانی پر عرق انفعال محسوس ہوگا اور اب زبان کھولنے کا موقع نہ رہے گا۔

یہ خاص بات ہے کہ اس عظیم اور پُر جلال تحدی کو رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زبانی پیش نہیں کیا گیا تاکہ اس میں انانیت کا پہلو پیدا نہ ہو بلکہ اسے براہ راست خالق نے اپنی ذات و جلال کی شان کے ساتھ "ہم" کے لفظ سے یاد کر کے یوں پیش کیا ہے کہ اگر تمہیں اس میں جو ہم نے اپنے "بندہ" پر نازل کیا ہے کوئی شک ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں خود رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ذاتی اقتدار اور ہنر آفرینی کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم اس کے اظہار کا صرف ایک واسطہ ہیں اور کچھ نہیں۔ اور یہی درحقیقت وہ نقطہ شک ہے جس کے بالمقابل یہ دعوت دی گئی ہے یعنی مشرکین اسے خود رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ذاتی کلام کہتے تھے۔ قرآن اسی کے بالمقابل میں جہاد کرنا چاہ رہا ہے اور انہیں متنبہ کرتا ہے کہ اگر رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ذاتی کلام ہوتا تو کوئی وجہ نہیں کہ تم باوجود فصاحت و بلاغت میں انتہائی کمال رکھنے کے اس کا مثل نہ لا سکو۔

اب اگر موجودہ زمانے کے بعض تجدد پسند افراد اُسے خود رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی دماغی پیداوار قرار دیتے ہیں اور "من اللہ" ہونے کا مفہوم صرف یہ قرار دیتے ہیں کہ وہ خداداد طاقتوں کا نتیجہ ہے تو یہ حقیقت میں اسی مقابل نقطہ کی صدائے بازگشت ہے جس کے خلاف اس آیت اور ایسی ہی متعدد آیتوں میں قرآن کریم نے ایک مستقل محاذ قائم کر رکھا ہے۔

مقابل والے کھلم کھلا شک کیسا انکار کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر چونکہ قرآنی آیات میں حقانیت واعجاز کے ایسے نمایاں آثار موجود ہیں کہ یہ شک ہونا نہ چاہیئے اس لیے قرآن گویا اسے باور نہیں کرنا چاہتا کہ انہیں واقعی شک ہے۔ اس لیے کہا کہ "اگر واقعی تم کو شک ہے" یہ چونکانے کا پہلا تازیانہ ہے۔

"تو اس کے ایسے کلام میں سے (پوری کتاب نہ سہی) ایک سورہ ہی لے آؤ" یہ دوسرا تازیانہ ہے۔ اس میں یہ امر ہے کہ وہ پوری کتاب پیش کردیں، اسے تو از اول ان کے حوصلہ اور ہمت ہی سے بلند قرار دیدیا گیا۔ اس کے بعد تو اگر انہیں ممکن ہوتا تو ضد ہوجاتی کہ اچھا تو سہی جو ہم پوری کتاب ہی لے آئیں۔ مگر قرآن نے تو بہت تخفیف کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تم ایک سورہ ہی پیش کردو۔ اس میں قید نہیں کہ طویل سورہ یا

مختصر۔

یہ تیسرا تازیانہ ہے "اگر تم سچے ہو" سچے کس بات میں! اسی میں کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے۔ اس سے انہیں نتیجہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر تم اجتماعی طاقت سے بھی ایسا نہ کرسکو تو تمہیں سمجھنا چاہیئے کہ تمہارا خیال غلط ہے۔ یہ حقیقت کسی انسانی طاقت کا نتیجہ ہے ہی نہیں بلکہ یہ بذاتِ خاص اللہ کا نازل کردہ ہے اور اسی کا کلام ہے۔ کسی آدمی کا کلام نہیں ہے۔

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اس ذیل میں رقم طراز ہیں "قرآن مجید اپنی فصاحت اور حسنِ انشاء کے لحاظ سے بھی یقیناً بے نظیر ہے۔ جیسا کہ عرب کے بڑے بڑے ماہرین ادب تسلیم کر چکے ہیں لیکن یہاں جو تحدی کی جارہی ہے اس کا مخاطب "یاایہالناس" کے ماتحت سارا عالم ہے صرف قریش یا اہل عرب نہیں۔ اس لیے قرآن مجید کو یہاں صرف انشاء و فصاحت تک محدود رکھنا اس کے عام و عالمگیر چیلنج کو محدود کردینا ہے۔

قرآن نے اپنی حقیقت خود یہ بیان کردی ہے کہ وہ "ہدی للمتقین" کتابِ ہدی ہے۔ یعنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کا جامع نظام، مکمل، ہمہ گیر و ہر جہتی دستور العمل۔ اس کے علاوہ اس کی اور جتنی حیثیتیں ہیں تبعی و ضمنی ہیں۔ وہ یہاں پیش اپنے سب سے بڑے وصف کو کر رہا ہے اور پکار کے کہہ رہا ہے کہ جو ہدایتیں اور بصیرتیں میرے ایک سورہ کے اندر موجود ہیں اب اگر تم اپنی متحدہ کوشش اور جدوجہد سے بھی اس کے مقابلہ میں کوئی چیز پیش کرسکتے ہو تو لاؤ دکھاؤ۔

"من مثله" میں مثلث کی تفسیر پر بہترین روشنی خود قرآن مجید ہی سے پڑتی ہے۔

"قل فأتوا بكتاب من عندالله هواهدی منہمااتبعہ ان کنتم صادقین" (القصص#49)

اھدی کے ایجاز میں سب کچھ آگیا۔

یہ امر کہ قرآن مجید بحیثیت فصاحت و بلاغت ہی نہیں بلکہ اور دیگر حیثیتوں سے بھی معجزہ ہے۔ علامہ بلاغی (رح) کی عربی تفسیر "آلاء الرحمن" کے مقدمہ اور پھر اُردو میں ہمارے "مقدمہ تفسیر" میں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن یہ امر کہ اس آیت میں مخاطب "یاایہالناس" کے ماتحت سارا عالم ہے۔ اس صورت میں پایہ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے کہ جب موجودہ نظم قرآنی ہی کی مطابقت سے یہ مان لیا جائے کہ یہ آیت تنزیل میں بھی گزشتہ آیات سے مرتبط ہے۔

دوسری صورت میں جبکہ اس کا مخاطب براہ راست قومِ عرب اور بالخصوص قریش کو مانا جائے تو پھر دوسرے افراد کے مقابلہ میں عنوانِ استدلال دوسرا ہو جائیگا۔ یعنی قومِ عرب اور قریش کی اس کے اس تحدی اور دعوت مقابلہ کے سامنے سپر انداختگی خود تمام عالم سے اس کی حقانیت تسلیم کرانے کے لیے حجت ہوگی۔ اس لیے چاہے چیلنج کا رخ ایک محدود سمت کے ساتھ مخصوص ہو مگر نتیجہ اس کا تمام عالم کے لیے مشترک حیثیت رکھتا ہے اور وہ کسی جماعت میں محدود نہیں ہے۔

"فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ" (24)

اب اگر تم نے ایسا نہ کیا اور ہرگز نہ کرو گے تو پہرہ بچنے کا سامان کرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور وہ کافروں کے لیے مہیا ہے"

یہ گزشتہ تازیانوں کے بعد ایک نہیں بلکہ ایک ساتھ متعدد تازیانے ہیں جنکی چوٹ سے اگر ذرہ برابر بھی امکان

ہوتا تو وہ بلبلا کر بغیر جواب لائے ہوئے قرار نہ لیتے۔

سچائی پر اعتماد تو دیکھئے کہ ایسے مخالف ماحول میں دشمنوں کی اس کثرت کے درمیان داعی حق حتم و جزم ، سکون و اطمینان بلکہ یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے "تم ہرگز ہرگز اس کا مثل نہیں لاؤ گے" ذمہ دار انسان کے لیے اتنے حتم و جزم اور یقین کے ساتھ اپنے مستقبل کے کسی فعل کے اعلان میں دشواری ہوتی ہے چہ جائیکہ دوسرے کا عمل اور وہ بھی مخاطب جماعت کا۔

یہ اعلان خود اس کا سب سے بڑا محرک ہوسکتا ہے کہ وہ اب اپنی پوری طاقت صرف کر کے اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اب اگر ایسا نہ ہوا اور قرآن کی سچائی پورے طور پر ثابت ہوئی تو ہر کھلے ہوئے دل سے غور کرنے والے کو ماننا پڑے گا کہ قرآن کا مثل لانا یقیناً طاقتِ بشری سے باہر تھا۔

بقول عبدالماجد صاحب "قرآن کے چیلنج کو ساڑھے تیرہ سو سال سے اوپر ہی ہوچکے ہیں اور دنیا کے کتب خانے اس کتاب سازی کے عہد میں، قرآن کے برابر کیا معنی تقریباً برابر کتاب سے بھی یکسر خالی ہیں" "ہرگز نہیں کرو گے" یعنی قیامت تک ، اللہ اکبر! کس زور کی تحدی ہے اور وہ بھی ایک "امی" کی زبان سے! اپنی عقل و حکمت، اپنے علوم و فنون پر ناز رکھنے والوں کو کیسا جوش اس وقت آیا ہوگا اور آج بھی آرہا ہے لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

"اگر ایسا نہ کیا اور ہرگز نہ کرو گے" یعنی اگر تم مثل اس کا نہ لائے اور ہرگز نہ لاسکو گے اس کی جزا یعنی اس "اگر" کا نتیجہ درحقیقت یہ ہے کہ "پھر ایمان لے آؤ ، تسلیم کرلو کہ یہ بے شک اللہ کا کلام ہے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر تم نے نہ مانا اور اپنے عناد پر اصرار قائم رکھا تو پھر اس کا نتیجہ وہ آخرت کا عذاب ہے جسے "آتشِ جہنم" کہتے ہیں ، کیونکہ وہ کافرین "یعنی جان بوجھ کر انکار کرنے والوں" ہی کے لیے مہیا ہے۔ اس دعوتِ ایمان کو جو تمامیتِ حجت کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیئے اور پھر اس دعوت کو قبول نہ کر کے کفر پر قائم رہنے کی پاداش ، ان دونوں کو انتہائی اختصار کے ساتھ "فاتقوا النار التي الخ" کے الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے۔ یعنی اب اس حجت کے قائم ہوجانے کے بعد انکار کا نتیجہ اس قسم کی آگ ہے جس کے بصورت بقائے انکار تم یقینی مستحق قرار پاؤ گے اس سے بچاؤ کا سامان صرف یہ ہے کہ کھلے دل سے حقیقت جا اعتراف کرلو اور کفر سے ہٹ کر ایمان کا راستہ اختیار کرلو۔

آتشِ جہنم کا عذاب تو درحقیقت نافرمان آدمیوں کے لیے ہے مگر ان آدمیوں ہی کے لیے اس سے بڑھ کر توہین یا سزا کیا ہوگی کہ اُن کے وہ معبود بھی جنکی وہ پرستش کرتے تھے اسی آگ میں جھونک دیئے جائیں۔ یہ ان پتھروں کو سزا دینا نہیں ہے بلکہ ان آدمیوں ہی کے عذاب کی تکمیل ہے۔ اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اس آگ کا ایندھن یہ آدمی بھی ہیں اور وہ پتھر بھی جو اُن کے معبود تھے۔ (5) اور پھر چونکہ وہ انہیں تصور کرتے تھے کہ یہ اللہ کے یہاں ہماری سفارش کریں گے تو آج انہیں بھی انہی کے ساتھ جھونک کر دکھادیا گیا کہ یہ سفارش کیا کریں گے ، یہ اللہ کے مقابلہ میں بے بس ہیں۔ (6)

"اعدت" یعنی مہیا کی گئی ہے، کے لفظ سے ظاہر ہے کہ دوزخ خلق ہوچکا ہے اور موجود ہے مگر پردہ غیب میں ہے جس پر "ایمان بالغیب" کا شعار رکھنے والوں کو کسی قسم کے شک و تردد کا محل نہیں ہے۔

"وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأَنُتُوا بِهَا مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (25)

اور مژدہ دو ان کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے کہ ان کے لیے بہشت کے گھنے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ جب بھی انہیں ان میں سے کوئی پھل کھانے کو ملیگا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو پہلے ہمیں کھانے کو مل چکا ہے حالانکہ انہیں وہ ملتا جلتا ہوا دیا گیا ہے اور ان کے لیے ان بہشتوں میں پاک بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے"

؛؛؛

"بشر" (مژدہ دو) کا مخاطب رسول صلی اللہ علیہ ولہ وسلم بھی ہوسکتے ہیں اور مخاطب غیر معین کی حیثیت سے یہ مقصود بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اس خوشخبری کے قابل ہیں۔ لہذا کوئی بھی ہو اسے حق ہے کہ وہ انہیں یہ مژدہ پہنچادے۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات جہاں اس قسم کا مفرد مخاطب ہے جیسے :

"اريت الذی یکذب بالدين"

"الم تر کیف"

وغیرہ ان میں یہ دونوں احتمال ہیں مگر میرے نزدیک ان میں سے اکثر مقامات ترجیح دوسرے ہی پہلو کو ہے جیسے آجکل کے طرزِ تحریر میں "ذرا دیکھو تو" یا "ملاحظہ کیجئے" کہا جاتا ہے اور اس سے مقصود کوئی خاص شخص نہیں ہوتا۔

مژدہ کے مستحق کون ہیں؟ وہ جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں ، یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآن کریم میں کسی ایک جگہ بھی جنت اور نعیمِ آخرت کی بشارت صرف ایمان پر مرتب نہیں کی گئی ہے بلکہ ہر جگہ ایمان کے ساتھ ساتھ اعمالِ صالحہ کا ذکر ضروری سمجھا ہے۔ اس کے بعد کاش انکی آنکھیں کھلیں جو صرف "جماعت مومنین" کا لقب اختیار کر کے اپنے کو اعمالِ صالحہ سے بے نیاز سمجھ لیتے ہیں اور "مومن" ہونے کے بعد

"حقوق اللہ" اور "حقوق العباد" کی پابندی کے بغیر ہی نعماتِ بہشت کے خوابِ خوشگوار میں مست ہیں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف اعمال کی پابندی کرنا اور اصول عقائد کی خبر نہ رکھنا بھی نجات کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے۔

مولوی عبدالماجد صاحب نے بالکل درست لکھا ہے : "نیک عمل کے سمجھنے میں بہتوں کو دھوکا ہوا ہے اور یہ مغالطہ آجکل بہت عام ہو گیا ہے۔ سمجھا یہ جانے لگا ہے کہ نیکی اور ایمان ایک دوسرے سے بالکل الگ اور بے تعلق چیزیں ہیں اور پھر اس مفروض کی ایک فرع یہ قائم کی گئی ہے کہ کوئی شخص ممکن ہے کہ بہت صالح اعمال کا ہو لیکن ایمان سے یک لخت محروم ہے۔ حالانکہ یہ تخیل ہی سرتاسر غلط ہے۔ نیکی ایمان سے الگ نہیں۔ ایمان ہی کی عملی شکل کا نام ہے۔ ایمان جب تک قلبی ہے ایمان ہے۔ اگر قوی و لسانی ہے تو اسلام ہے اور وہی ایمان جب عمل سے ظاہر ہونے لگتا ہے تو اس کا نام حسنِ عمل ، حسنِ کردار یا عمل صالح پڑ جاتا ہے اور حسنِ عمل کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ عمل رضائے الہی کے مطابق ہو، کوئی نیکی اگر پیش کی جاتی ہے جس کی تہہ میں جذبہ ایمانی خفیف سا بھی موجود نہیں تو وہ نیکی نہیں نیکی کی صورت ہے، نیکی کی نقل ہے۔ اور جس طرح نماز کی نقل محض نماز نہیں، اسی طرح کسی نیکی کی نقل پر اطلاق نیکی کا نہیں ہوسکتا۔ عمل نیک کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل ضابطہ شریعت کے مطابق ہو"

اس میں صرف یہ جزو قابلِ ترمیم ہے کہ "ایمان قوی و لسانی ہو تو اسلام ہے" ایسا ہی نہیں بلکہ عملی بھی باہیں معنی کہ اعمالِ صالحہ کے مطابق شریعتِ اسلام ظاہری طور پر پابندی ہے مگر اصولِ اعتقاد قلبی طور پر

مستحکم نہیں ہیں تو وہ بھی اسلام ہی ہوگا۔

اس کے ساتھ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ جب خوشخبری ، نوید اور مژدہ جہاں بھی ہے اس میں جس طرح ایمان تنہا نہیں ہے اسی طرح "عمل صالح" بھی۔ تو اب اس بحث کی اہمیت ہی نہیں رہتی کہ بغیر ایمان عمل صالح ہوسکتا ہے یا نہیں ، جبکہ قرآن کریم نے عمل صالح کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا ہے تو بغیر ایمان تنہا

اعمال صالحہ ہوں بھی تو نجات کا استحقاق سمجھنا قرآن کریم کی رو سے غلط ہی قرار پائیگا۔

اس کے ساتھ ساتھ ایمان اور اعمال صالحہ میں ایک فرق بھی قرآن کریم سے ثابت ہے اور وہ یہ کہ استحقاق اور وعدہ جنت میں ہیں تو دونوں ضروری، لیکن اگر ایمان ہے اور اعمال صالحہ میں کمزوری ہے تو بطور "عفو و کرم" مغفرت کا امکان ہے لیکن اگر ایمان ہی نہیں ہے تو پھر مغفرت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے :

"ان الله لا يغفر ان يشرك به و يغفر مادون ذلك لمن يشاء"

یقیناً اللہ اسے کبھی نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جو گناہ ہو اسے جس کے لیے چاہتا ہے بخش دیتا ہے"

آخری لفظ "لمن يشاء" سے ظاہر ہے کہ یہ مغفرت بطور وجوب اور بحیثیت عموم نہیں ہے بلکہ بطور امکان اور بطور ایجاب جزائی ہے۔ لہذا اس کے بالمقابل حکم جو نفی ایمان کی صورت میں "لا يغفر" کے لفظ سے دیا گیا ہے وہ بطور امتناع اور بطور سلب کلی ہوگا اور اس کے بعد ان دونوں کی مقابل جماعت یعنی ایمان اور عمل صالح دونوں درجوں پر فائز افراد کے لیے جو مژدہ نجات اور نعیم جنت کا ہے وہ بطور وجوب اور بطور ایجاب کلی ہے جس میں کسی استثنا کی گنجائش نہیں ہے اور یہی وہ ہے جس کا عقلی طور پر عدل الہی بھی متقاضی ہے۔ باغ کا یہ وصف کہ اس کے نیچے سے نہریں جاری ہیں اس لحاظ سے لایا گیا ہے کہ باغ اصل میں زمین نہیں بلکہ درختوں کا نام ہوتا ہے، اس لیے نہریں اگرچہ زمین کے اوپر ہیں مگر باغوں کے لحاظ سے انہیں نیچے ہی کہنا درست ہے۔ (7)

جب بھی انہیں کھانے کو ملے گا وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم دنیا میں کھا چکے ہیں" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخرت کے پھل جنس کے اعتبار سے وہی ہونگے جو دنیا میں ہوا کرتے ہیں اور "جب بھی" کے الفاظ جو بطور کلیہ ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخرت کے میوے محدود اُن ہی اقسام میں نہیں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے اس لیے کہ عرب اُن سے واقف تھے۔ کیونکہ اہل جنت کا دائرہ کسی خاص قوم و ملک والوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر ملک کے ایمان و عمل صالح اختیار کرنے والے اس "مژدہ" کے عموم میں برابر کا حصہ رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ پھل ہر ملک کے مختلف ہوتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ میوے جن کا ذکر قرآن میں نام کے ساتھ ہے بعض ممالک میں پیدا ہی نہ ہوتے ہوں لیکن قرآن اُن میں سے ہر شخص کا ہر ایک میوہ کے ملنے کے وقت یہ قول بیان کر رہا ہے کہ یہ وہی ہے جو دنیا میں ہمیں ملا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کو وہی پھل ملیں گے جنہیں وہ دنیا میں شوق سے کھاتا رہا ہے۔ جب ہی تو وہ یہ کہے گا کہ ارے یہ تو وہی ہے جو دنیا میں ہم کھا چکے ہیں۔ (8)

قرآن کریم نے انکے اس قول کو حق بجانب بھی قرار دیا ہے اور واقعہ کے اعتبار سے کسی حد تک غلط بھی۔ یعنی انکا یہ کہنا اس لیے حق بجانب ہے کہ شکل و صورت اور شمائل میں وہ اس دنیا ہی کے پھلوں کی طرح ہیں لہذا انہیں یہ کہنا چاہیئے کہ یہ وہی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ اُن پھلوں سے حقیقت کے لحاظ سے بالکل

مختلف ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی ساتھ ایک لفظ "متشابہا" سے ظاہر کی گئی ہیں کیونکہ مشابہت ہمیشہ دو ایسی ہی چیزوں میں ہوتی ہے جو ذاتاً مغایرت رکھتی ہوں لیکن کسی صفت یا صورت میں ملتی جلتی ہوں۔

آخر میں اہل جنت کے لیے "ازواج مطہرہ" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں حوریں بھی آسکتی ہیں اور جن نیک شوہروں کی دنیا والی نیک بیویاں اس لائق ہوں کہ وہ بہشت میں اپنے شوہروں کے ساتھ رکھی جائیں وہ بھی داخل ہوسکتی ہیں۔

"مطہرہ" کے لفظ میں ان جسمانی حدث و خبث والی کثافتوں سے پاکیزگی بھی داخل ہے جو جنت کے لیے موزوں نہیں ہیں اور اخلاقی برائیوں سے بھی۔

جبکہ ازواج حوروں کے قبیل سے ہوں تو اس وصف سے متصف ہونا ظاہر ہے اور دنیاوی بیویاں بہشت میں داخل ہونے کے بعد اُن کے طبائع جسمانی و روحانی میں بھی وہ اعتدال پیدا ہوگا کہ جسمانی و روحانی کثافتیں جو دنیا کی مادی آب و ہوا کے لوازم میں سے ہیں وہاں باقی نہ رہیں گی اور اس لیے وہاں وہ "ازواج مطہرہ" کے لقب کی مستحق قرار پا سکیں گی۔ (9)

آخری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اہل جنت ان نعمات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو نعیم جنت میں دنیا کی ہر لذت و راحت سے ایک ایسا امتیاز پیدا کرتی ہے کہ وہاں (جنت) کی کوئی ایک چھوٹی سے چھوٹی نعمت دنیا کی تمام نعمتوں کے مجموعہ سے زیادہ بیش قیمت قرار پاجاتی ہے کیونکہ دنیا کی ہر نعمت چاہے کتنی ہی لذیذ کیوں نہ ہو بہر حال فانی ہے اور آخرت کی ہر ہر نعمت ہمیشہ کے لیے باقی ہے اور اسی مفادِ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کا بڑے سے بڑا مفاد بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کو مرضی خالق کے مقابلہ میں نہ کسی لالچ میں مبتلا ہونا چاہیئے اور نہ کبھی کسی خوف سے متاثر ہونا۔

**

-
- (1) چندھیا دے (تاج العلماء)
 - (2) یکفی فی النعمتہ علینان یكون فی الارض بسائط و صواضع صفر و شة و مسطوقہ و لیس یحب ان یكون جمیعہا کذاک (مجمع البیان)
 - فسواء کذاک او علی شکل الكرة فالافراش غیر فستنکر و لامدفع لعظم جرمہا و تباعد اطراف (نیشاپوری)
 - (3) و لیس فی ذلک صراحة بموافقة الهيئة القديمة و لاصراحة بمخالفة الهيئة الحديدة (بلاغی)
 - (4) کل شئ کان فوق شئ اخر فهو لما تحته سماء (طبری)
 - (5) الظاهر ان کون الناس والحجارة وقود النار ای حطبہا یرید بہ اصنامہم المنحوتة الحجارة کفرلہ تعالی انکم و ماتعبدون من دون اللہ حصب جہنم۔ (مجمع البیان)
 - (6) لما اعتقد الکفار فی حجاتہم المعبودة من دون اللہ انها الشفعاء۔ (رازی)
 - (7). اراد الخبر عن ماء انہارہا بانہا جاریة تحت الاشجار لان الماء اذا كانت تحت الارض فلاحظہ فیہا للعیون (مجمع البیان)
 - (8). معناه هذا الذی رزقنا من قبل فی الدنیا عن ابن عباس وابن مسعود (رضوان اللہ علیہما) قال الشیخ ابو جعفر واقوی الاقوال قول ابن عباس (رض) (مجمع البیان)

(9). قيل هن الحور العين و قيل هن من نساء الدنيا قال الحسن هن عجائزكم الغمض الرمض الغمش طهرن من قذرات الدنيا.